باب التقریظ والانتقاد

سفر

رئیس احمد جعفری

قدرت کی طرف سے جسٹس ایس۔ اے رحمان کو گوناگوں اور بوقلموں صفات و کمالات ودیعت ہوئے ہیں۔ وہ بیک وقت بہت کچھ ہیں۔ ماہر آئین و دستور بھی، ایک بہترین مقنن بھی، نکتہ طراز ادیب بھی، خوش گفتار خطیب بھی، سخن فہم بھی، سخن سنج بھی، محتسب بھی، نقاد بھی، مفکر بھی اور شاعر بھی۔ ساتھ ہی ساتھ بہت سے تہذیبی، ثقافتی، علمی، ادبی، اور سماجی اداروں کے روح رواں بھی۔ مصروفیات کا بے پناہ ہجوم نہ ان کی شگفتگی مزاج میں حائل ہوتا ہے۔ نہ جوش کار میں۔ انھوں نے اردو ادب کا دامن لعل و گوہر سے بھر دیا ہے۔ انھوں نے بہت کم کہا ہے۔ لیکن جو کچھ کہا ہے خوب اور بہت خوب کہا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مظلوموں پر جو کچھ گزری وہ تاریخ ہند کا ایسا المناک، اور جگرخراش باب ہے جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ عالم قاصر ہے۔ ان حوادث نے ہر دانشور ہر مفکر، ہر ادیب اور ہر شاعر کو دعوت نطق و کلام دی۔ اخبارات میں دھواں دھار بیانات شائع ہوئے۔ رسائل میں لرزہ خیز مقالات چھپے۔ ڈرامے لکھے گئے۔ افسانے تحریر کیے گئے۔ ناول عالم وجود میں آئے۔ اور شاعروں نے تو گویا قلم توڑ دیا۔ — رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونناب بار!

ادب کے بازار میں شاعر اور ادیب اپنی یہ پونجی لے کر پہنچے۔ داد و تحسین کا خراج لے کر واپس آئے۔ پھر نہ داد دینے والوں نے کچھ یاد رکھا، نہ بازار ادب میں یہ چیزیں سکۂ رائج الوقت

بن سکیں۔

لیکن "سفر" ایسی کامیاب تخلیقی کوشش ہے جو اپنی نوعیت، انفرادیت، زبان و بیان کی گیرائی اور اثر انگیزی، اسلوب کی معنویت اور فکر کی بلندی کے اعتبار سے بلاشبہ اردو زبان کا قابل فخر اور لازوال سرمایہ ہے۔ اس میں جذبات ہیں لیکن ٹھہراؤ کے ساتھ، درد ہے لیکن ٹیس کے ساتھ نہیں کسک کے ساتھ۔ زبان کی رعنائی ہے۔ نگینے کی طرح ترشے ہوئے الفاظ نئی اور شگفتہ ترکیبیں۔ آنسو ہیں لیکن سمندر کی طرح نہیں شبنم کے قطروں کی طرح۔ یہ ایک عجیب چیز ہے جو جانِ سخن ہے ـــــ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے۔ "سفر" کے اشعار پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے شاعر کے واردات میں نوائے سروش بھی شامل ہے۔

کتاب کا تمہید "تحریک پاکستان کے ان گمنام رضا کاروں کے نام ہے جن کے ذکر سے تاریخ آزادی کے اوراق خالی ہیں"

اس کے بعد آغازِ سفر ہوتا ہے اور سفر کی داستان بیان کرنے والا خود ہی بتاتا ہے:

"اس شعری داستان کا موضوع مشرقی پنجاب کے ایک بوڑھے مہاجر کا جسمانی، روحانی اور ذہنی سفر ہے۔ وہ اپنے آبائی گاؤں کو اس وقت چھوڑتا ہے جب کہ حب الوطنی اور مذہب کے نام پر گاؤں تباہ کیا جا چکا ہے اور اس کے باشندے تعصب اور تنگ نظری کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ وہ سخت جان بوڑھا یکہ و تنہا پاکستان کا رُخ کرتا ہے۔ راستے میں تھکن سے چور ہو کر ایک درخت کے تنے سے لگ کر سو جاتا ہے۔ اس کی اپنی یادیں مسلمان قوم کے اجتماعی شعور سے، اس کے دماغ میں، نیند کی چھاؤں میں گڈمڈ ہو جاتی ہیں، اور منفصل تاریخی مناظر کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ہندوستان میں آریاؤں کے ورود سے لے کر انگریزی عملداری کے اختتام تک کے چیدہ چیدہ واقعات خواب کے طلسمی عمل سے علامتی ہیئت اختیار کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ خواب تحریک پاکستان کے نعروں کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔ اور مسافر بیدار ہو کر ایک نئے عزم کے ساتھ دوبارہ اپنی راہ لیتا ہے۔ اثنائے راہ ایک سکھ عورت اپنی مقتول مسلمان سہیلی کا بچہ اس کے حوالے کرتی ہے۔ یہ

واقعہ گویا پاکستان کے تخلیق کی تمثیل ہے۔ بالآخر بوڑھا مسافر بچے کو لے کر پاکستان کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور افق پر چاند ستارے کا نشان دیکھ کر سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ یہی "سفر کی آخری منزل ہے۔"

ان سطروں کے مطالعہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سفر کی حکایت بیان کرنے والا تاریخ کے اوراق بھی کھنگال چکا ہے۔ نفسیات انسانی پر بھی عبور رکھتا ہے۔ کہانی کے اتار چڑھاؤ کے فن سے بھی واقف ہے۔ وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں فن کار بھی ہے۔ اور اس کا فن یک جہتی نہیں ہمہ جہتی ہے۔

سب سے پہلے ہمارے کان "ندائے غیب" سنتے ہیں:

فنا کی بستی ہے باغ ہستی نہ گل رہے گا نہ خار ہوگا
نہ فرشِ خاکی رہے گا باقی نہ آسماں کا غبار ہوگا
گزشتنی ہے بہارِ دنیا، شکستنی ہے خمارِ دنیا
ہوا جو پیدا جہانِ امکاں میں وہ قضا کا شکار ہوگا
اٹھائے پھرتا ہے ابنِ آدم ضعیف کندھوں پہ اک امانت
قدم قدم کا حساب ہوگا، نفس نفس کا شمار ہوگا

. . . . . !

بحر کا انتخاب اور الفاظ کا دروبست، بجائے خود ایک ایسا تاثر پیدا کرتا ہے کہ پڑھنے والا اس اقلیم سخن میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دل ٹکڑے ہو کر آنکھوں کے راستے بہنے لگا ہے۔ یہ چند بول ہیں لیکن ان میں شکوہ اور دبدبہ بھی ہے۔ غم کی چاشنی بھی۔ اور بے ثباتی دنیا کا عبرت ناک مرقع بھی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے جو کام چند صفحے نہیں کر سکتے وہ چند الفاظ کر گذرتے ہیں۔ غالب کا یہ شعر تو آپ نے بارہا پڑھا ہوگا:

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

غزل کو ہمارے شاعر نے ایک تصویر بنا کر پیش کر دیا ہے:

اٹھائے پھرتا ہے ابن آدم ضعیف کندھوں پہ اک امانت
قدم قدم کا حساب ہوگا، نفس نفس کا شمار ہوگا

سفر شروع ہو چکا ہے کیوں نہ ہم بھی مسافر کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کریں۔

یہ بستی بھی بستی تھی کچھ دیر پہلے
مگر اب خرابہ کہ دل جس سے دہلے
کہیں تھیں نعتے جوانوں کی لاشیں
کہیں کم سنوں ناتوانوں کی لاشیں
جو خوش بخت تھیں بیٹیاں کٹ چکی تھیں
کہ باقی ''شریفوں'' میں سب بٹ چکی تھیں

یہ روح فرسا منظر دیکھ کر مسافر:

چلا یوں نکل کر سوادِ وطن سے
جدا جس طرح روح ہوتی ہے تن سے
وہ اک ڈھیر کے پاس کچھ اٹکا
مگر چل دیا دے کے گردن کو جھٹکا
جہاں اب فقط راکھ تھی اور دھواں تھا!
وہیں اس جگر سوختہ کا مکاں تھا!

..........!

یکایک پھسل کر گرا وہ زمیں پر
تھی پگڑی کہیں پر، عصا تھا کہیں پر

..........!

پورے استبداد اور خوں آشامی کے ساتھ صفایا کردیتے ہیں۔ اس منظر کو شاعر نے زبان شعر سے اس طرح بیان کیا ہے جیسے کوئی باکمال مصوّر اپنے موقلم سے ایک تصویر کھینچ کر رکھ دے:

اک برہمن نے آکر لاٹھی کو یوں گھما یا
بدھ مت رہا وطن میں باقی نہ اس کا سایا
استھان بن رہے ہیں بھارت سے دور ہٹ کر
پھولی پھلی ہے ڈالی، اپنے تنے سے کٹ کر

یہ آخری مصرعہ تو اپنے اندر ایک جہانِ معنیٰ آباد رکھتا ہے۔ جس ملک پر بدھوں کی غالب اکثریت تھی اسے برہمن ازم نے اس طرح شکست دی کہ وہ جلاوطن ہوگیا۔ آج چین، جاپان، برما، لنکا اور جنوب مشرقی ایشیا میں کروڑہا کی تعداد میں بدھ مت کے پیرو موجود ہیں۔ لیکن اپنے وطن میں وہ اتنی تعداد بھی نہیں رکھتے کہ کسی صوبائی اسمبلی میں اپنا ایک آدمی بھی ممبر منتخب کرا سکیں۔

پھولی پھلی ہے ڈالی اپنے تنے سے کٹ کر

یہ ایک مصرعہ پوری تاریخ ہے۔

ان رواں دواں مناظر کے ہجوم میں مردِ مومن ابھرتا ہے جو ہندوستان میں داخل ہو رہا ہے۔
ہندوستان ——— میرِ عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے!
شاعر کا شکوہ الفاظ خود ایک لشکر گراں سے کم نہیں:

میداں میں نقارہ گونجا
ایک بگولا اٹھا، لپکا!!
آنکھوں میں ہنگامے ابھرے
شملے اور عمامے ابھرے
دوڑے ایسے سرپٹ گھوڑے
گویا تیر قضا نے چھوڑے

بھالے اور شمشیریں چمکیں!
ہاتھوں میں زنجیریں کھنکیں
نعرے گونجے: "اللہ اکبر"
سہمے بت مندر کے اندر
بجلی چمکی، بادل گرجا
دھرتی نے پھر پلٹی کایا!

غزنوی، غوری، ایبک کا دور آتا ہے اور چشم تماشا کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اب ابراہیم لودھی، اور ظہیر الدین بابر میں جنگ ہوتی ہے۔

لودھی کی فوج:

استادہ مست ہاتھیوں کا اک طرف حصار
قائم ہیں جس کے سلسلے مانند کوہسار!

بابر کا لشکر:

شعلے دہانِ توپ سے نکلے جو کوند کر
ہاتھی فرار ہو کر اپنوں کو روند کر
سونڈیں اٹھائے چیختے چنگھاڑتے گئے
پشتوں سے بوجھ راستے میں جھاڑتے گئے
کوئی پکار اختتم ہوا لودھیوں کا راج
مغلوں کے سر پہ آج ہے فتح و ظفر کا تاج

ایک تاریخی اور فیصلہ کن جنگ کا نقشہ چند سیدھے سادے الفاظ میں کھینچ دینا اگر سہل ممتنع نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر عہد مغلیہ کا مرقع سامنے آتا ہے۔ یہ بابر ہے۔ یہ ہمایوں ہے۔ یہ دین الٰہی کا موجد اکبر

یہ رند لاابالی جہانگیر ہے۔ یہ شاہجہان اعظم ہے۔ تاج کا خالق اور اپنے ہی قلعہ کا قیدی۔ یہ مرد درویش و مصحف نویس عالمگیر۔ پھر رنگیلے شاہ جلوہ فرما ہوتے ہیں۔ یکایک نادر شاہ کی تیغ بے اماں چمکنے لگتی ہے دلّی کی گلیاں خون مسلماں سے لال ہو جاتی ہیں ـــــ ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو ـــــ

یہ نابینا شاہ عالم ہیں۔ ہندوستان کی مسلم حکومت پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے۔ مرہٹے "گریٹ مرہٹہ ایمپائر" کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ سکھ اپنی بادشاہت قائم کر رہے ہیں۔ انگریز سوداگر کمپنی کے نام پر حکومت کا ڈراما کھیل رہا ہے۔ ان سب مناظر کی شاعر نے اس طرح مرقع گری کی ہے کہ کسی طرح کی تشنگی باقی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ جب حالت یہ ہو جاتی ہے کہ:

نواب شہر شہر میں راجے نگر نگر!!
ٹوپی ادھر ہے تخت پر دستار ہے ادھر
اڑ کر گئی ہیں بھارتی چادر کی دھجیاں
کچھ مرہٹہ کے ہاتھ میں کچھ خالصہ کے سر

اس لامرکزیت سے فائدہ اٹھا کر، انگریز تکلف برطرف کر کے باقاعدہ حکمران بن جانے کا خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ ویسے عملاً زمام سلطنت ہے الٰہی کے ہاتھ میں۔ اسی اثنا میں:

چربی اور بندوق کے جھگڑے سے نکلی چنگاری
جس نے اٹھ کر نگر نگر میں کر دی شعلہ کاری

.....

بیٹھا ہے دربار کے اندر ملزم شاہنشاہ
جرم شہی، افسنگی قاضی، ابن الوقت گواہ

بہادر شاہ کی بے بسی، غدر کی تباہ کاری، اور مسلمانوں کے انتشار اور پراگندگی کا اس سے بہتر مرقع کھینچا نہیں جا سکتا ـــــ

اے مصور ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں

غدر کے بعد اگر سرسید اپنی بے مثال عزیمت و استقامت کے ساتھ نمودار نہ ہوتے تو مسلمان ختم ہو جاتے۔ ہندو ان کے دشمن تھے، تو انگریز دشمن جاں۔ اس حالت میں سرسید میداں میں آتے ہیں:

ایک بڈھا کہہ رہا ہے اے مسلمانو! پڑھو
عقل کے زینے سے تم بام ترقی پر چڑھو
ہو چکا جو ہو چکا، سوچو کہ کل لائے گا کیا
نام لو اللہ کا، آگے بڑھو آگے بڑھو

اسی سلسلے میں حالی اور اکبر بھی اپنی اپنی لے میں اپنا اپنا راگ سناتے ہیں کہ تحریک خلافت عالم وجود میں آتی ہے۔ اتحادی طے کر لیتے ہیں کہ ترکوں کو ختم کر دیا جائے۔ مسلمانانِ ہند علی برادران اور مولانا ظفر علی خاں وغیرہ کی قیادت میں برطانوی استبداد کے خلاف کفن سر سے باندھ کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ گاندھی جی مسلمانوں سے اتحاد کرتے ہیں۔ ہندو، مسلمان، سکھ بھائی بھائی بن جاتے ہیں۔ اور فرنگی استعمار کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اسی دور میں جنرل ڈائر کی گولیاں جلیاں والا باغ امرتسر میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کو بھون ڈالتی ہیں:

بے بس شہری جان بچا کر گرتے پڑتے بھاگے
کچھ لیٹے تو ایسے سوئے پھر نہ کبھی وہ جاگے

ظالم اور مظلوم کی کشمکش جاری ہے۔ مسلمانوں کی ایک جماعت ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر ہجرت کا فیصلہ کر لیتی ہے:

پر جوش مسلموں کے کچھ قافلے رواں ہیں
بوڑھے ہیں چند ان میں، چند ان میں نوجواں ہیں
گھر بار اونے پونے اوروں کو دے چلے ہیں
ایمان کا اثاثہ ہمراہ لے چلے ہیں

تکبیر ہے زباں پر، دل میں غمِ خلافت
پیشِ نظر ہے اپنے پیارے نبیؐ کی سنّت

تحریک ہجرت کا مذاق شروع سے اڑایا جاتا رہا ہے۔ رحمان صاحب پہلے شخص ہیں جس نے اس تحریک کو اور اس کے مضمرات کو صحیح رنگ میں دیکھا اور نکھرے ہوئے انداز میں بیان کر دیا۔

تکبیر ہے زباں پر، دل میں غمِ خلافت
پیشِ نظر ہے اپنے پیارے نبیؐ کی سنّت

یہ بات صرف وہی کہہ سکتا تھا جس کا دماغ بھی مسلمان ہو اور دل بھی۔

اس کے بعد پھر منظر بدلنے لگتے ہیں۔ گاندھی جی کا برت، ستیہ گرہ، اھنسا، چرخا، رام راج۔ یہ سب گاندھی جی کے وہ متفرق نعرے ہیں جو وقتاً فوقتاً فضائے ہند میں گونجتے رہے تھے۔ مسافر بھی یہ نعرے سن رہا ہے۔

اس کے بعد تحریک ترک موالات کا دور آتا ہے۔ بدیسی مال کا بائیکاٹ شروع ہوتا ہے۔ کھدر اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

اور اس کے بعد گاندھی کی وہ مبنی پر تشدد تحریک شروع ہوتی ہے جس کا نام تھا Quit India (ہندوستان چھوڑ دو)۔ یہ تحریک صرف غم و غصہ کا نتیجہ تھی۔ گاندھی جی نے دوسری جنگ عظیم میں محوریوں کی پیہم اور مسلسل کامیابیاں، اور اتحادیوں کی پیہم اور مسلسل ناکامیاں دیکھ کر یقین کر لیا تھا کہ بازی جرمنی کے ہاتھ میں رہے گی، اور انگریز کہیں کے نہ رہیں گے۔ سوبھاش چندر بوس کا قید خانے سے فرار ہو کر جرمنی پھر جاپان پہنچ جانا سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔

شروع سے گاندھی جی کا یہ عقیدہ رہا تھا کہ ہندوستان، ہندو مسلم اتحاد کے بغیر آزاد نہیں ہو سکتا۔ ہندو مسلم اتحاد کی اب وہ ضرورت نہیں محسوس کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کو ان کے مطالبات کو، ان کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو، ان کے قائداعظم کو یکسر نظر انداز کر رہے تھے۔ اور ان کا مطالبہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت بھی یہی کرے۔ وائسرائے بہادر بھی

یہی کریں۔

حالات اگر سازگار ہوتے تو شاید یہ مطالبہ مان لیا جاتا۔ لیکن جنگ کے اس خطرناک ترین مرحلے پر انگریز، مسلمانوں کا ہمدرد نہ ہوتے ہوئے اور ان سے پرخاش رکھتے ہوئے بھی انھیں یکسر نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔ جتنا کر سکتا تھا اس نے کیا بھی۔ لارڈ ویول وائسرائے ہند نے کلکتہ میں اعلان کر دیا:

"کسی ملک کا جغرافیہ نہیں بدلا جا سکتا۔"

یہ اعلان پاکستان کی نفی پر مبنی تھا۔ لارڈ ایٹلی نے بعد میں اعلان کر دیا کہ:

"کسی اقلیت کو، اکثریت کے راستے میں حائل ہونے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

یہ اعلان بھی پاکستان کی نفی پر مبنی تھا۔ لیکن گاندھی جی ان باتوں سے مطمئن نہیں ہوئے انھوں نے انگریزوں سے مطالبہ کیا، تم ہندوستان سے رخصت ہو جاؤ۔ ہم مسلمانوں سے بھگت لیں گے۔ اور اگر تم نہ گئے تو ہم سول وار کا آغاز کر دیں گے، اور خون کی ندیاں بہا دیں گے یہ اعلان وہ شخص کر رہا تھا جس نے "عدم تشدد" یا اہمسا کو سیاسی پالیسی کے طور پر نہیں مذہبی عقیدے کے طور پر قبول کیا اور اپنایا تھا۔

انگریزوں نے ہندوستان نہیں چھوڑا۔ توڑ پھوڑ کی تحریک شروع ہو گئی۔ شاعر نے صرف تین شعروں میں ساری تاریخ اس تحریک کی بیان کر دی ہے:

شعلے لپک رہے ہیں تھانوں سے دفتروں سے
آہیں سی اٹھ رہی ہیں گوروں کی محفلوں سے
ریلیں رکی کھڑی ہیں بے کار سیٹیاں ہیں
پٹڑی اٹی ہوئی ہے جنتا کی گردنوں سے
"ہندوستان چھوڑو، ہندوستان چھوڑو"
الجھی ہے لال پگڑی بازار میں جتھوں سے!

تاریخ ہند کا یہ نازک ترین لمحہ تھا۔

اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں کو نکال کر مسلمانوں کو غلام بنا لیا جائے۔

اس تحریک نے انگریزوں کو سراسیمہ اور دہشت زدہ کر دیا تھا۔ ہندوستان کی اقلیتیں دبک کر سمٹ گئی تھیں۔ وہ اس درجہ سہمی ہوئی تھیں کہ اپنے سارے مطالبات بھول گئیں۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ کانگرس کے ساتھ تھا۔ اور گاندھی جی کے ہاتھ مضبوط کر رہا تھا۔ گاندھی جی مکمل شہنشاہی اختیارات سے کم پر کسی طرح راضی نہیں تھے۔ اتنے میں خوابیدہ مسافر کو ایک چہرہ ابھرتا نظر آتا ہے جس کی تصویر شاعر نے بایں الفاظ کھینچی ہے:

راست رو، راست باز، دور اندیش
وہ سیاست کا باصفا درویش
سرو قد، خوش لباس، خوش گفتار
تن کا نازک ہے، عزم کا کہسار
اس کے لفظوں میں ہے عجب تاثیر
گونجتی ہے فضا میں یہ للکار!!

قائداعظم کے شمائل و فضائل کا یہ کتنا مکمل مرقع ہے۔

خوابیدہ مسافر کے کانوں میں قائد کی للکار گونجتی ہے:

صدیوں سے تیرے سر پہ غلامی کا بار ہے
اس بارِ جاں گداز کو سر سے اتار۔ اٹھ
کم ظرف ہیں یہ حبِ وطن کے اجارہ دار
خود اپنی رہ تراش، حقیقت شعار۔ اٹھ
تاریک صبح زندگی اب ہند میں ہوئی
دن کو اُجال دے مرے شمس النہار۔ اٹھ

ہے بے قرار گلشنِ اسلام کی زمیں
رت پھر بہار کی ہے نسیم بہار۔ اٹھ
ایمان و اتحاد ہوں تنظیم کے رفیق
سر سے کفن لپیٹ کے مردانہ وار اٹھ

. . . . . .

یہ للکار بجلی کا کڑکا تھی ـــــ زمیں ہند کی جس نے ساری ہلا دی۔
پاکستان کا نعرہ اب ہر مسلمان کی زبان پر تھا۔
اس نعرے کا زور کم کرنے کے لیے پہلے عدم تشدد کے پرستاروں نے دھمکی دی ؎

دریا دریا خون بہے گا
بھارت دیش اکھنڈ رہے گا

لیکن جب دھمکی سے کام نہ چلا تو تھپکی دی۔ دھمکی اور تھپکی یہ دونوں کام بنیئے ہی بیک وقت انجام دے سکتے ہیں۔ شاعر نے بنیا ذہنیت کو جس صناعی سے بے نقاب کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ بنیا گیت گاتا ہے۔ اور اس گیت میں ہندوازم کی پوری تاریخ آجاتی ہے ـــــ طنز لطیف کے جلو میں بنیا مسلمان سے کہتا ہے:

ہم تم بھارت باسی سارے آجا میرے پریم دوارے
جو کچھ تیرا، سو سب میرا تجھ کو کیسی چنتا پیارے
کھیتی تیری، حاصل میرا، قرضہ تیرا، لیکھا میرا
جی کا لاگو یہ الجھیڑا، میرا جیون تیرے سہارے
رن میں تو ہی آگے ہوگا، تو دشمن کا سر کاٹے گا
نت نت ہو سردار تیری، ہر دم تیرا داس پکارے
آجا پریم کتھائیں رٹ کر، لیکن بیٹھ ذرا تو ہٹ کر

جاتی بندھن سخت کڑے ہیں تجھ کو کافی چنداشارے
میرا مندر اور رسوئی، ان میں آئے اور نہ کوئی
تجھ سے رشتے ناطے ہوتے ایسے کب تھے بھاگ ہمارے
نفرت تجھ سے؟ توبہ توبہ، یہ کیا تیرے دل میں آیا
دیش اپنے کی ریت یہی ہے سن لے میرے سُرجن تارے
مشکل تجھ سے گھل مل جانا، لیکن اس سے مت گھبرانا
اپنا ہے بس ایک گھرانہ، بھارت دیش اکھنڈ ہے پیارے

. . . . . .

لیکن وہ زمانہ اب گزر چکا تھا جب مسلمان سادہ لوحی سے مات کھایا جایا کرتا تھا۔ اب تو وہ میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے بنیئے کے اس رس بھرے گیت کا جواب طبل جنگ سے دیا۔ وہ عرصۂ رزم میں وارد ہوا لیکن کس طرح؟

بٹ کے رہے گا ہندوستان
لے کے رہیں گے پاکستان!
قائداعظم زندہ باد!
پاکستان کا مطلب کیا؟
لا الٰہ الا اللہ!!!
پاکستان زندہ باد!

شاعر نے ان چند الفاظ میں پوری تحریک پاکستان سمو دی ہے۔ ہر اہم اور ضروری گوشہ نظر کے سامنے آگیا ہے۔

مسافر سوتے سے جاگا۔ یہ جاگنا پیام بیداری ثابت ہوا۔ خود اس کا لڑکا بھی اس تحریک کے رضا کاروں میں شامل تھا، اور وہ خود بھی اک ولولۂ تازہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا:

جوانوں کی تکبیر کانوں میں گونجی
تمنّا کی لو ہو گئی اور اونچی!
نہ تشویش کوئی نہ اب کوئی مشکل
کمر باندھ لی چل پڑا سوئے منزل

. . . . . !

مسافر چلا، چلتا رہا۔ ایک جھنڈ کے پاس پہنچا، اور یہاں پہنچ کر کیا دیکھتا ہے:

ہری گھاس پر لاشے بکھرے پڑے تھے
کہ جیسے درختوں سے پتے جھڑے تھے
کہیں تھا اندھیرا کہیں تھا اجالا
ادھر کوئی لاٹھی، ادھر کوئی بھالا

. . . . . .

یہ مسلمانوں کے بے گور و کفن لاشے تھے۔ لیکن درندگی اور بہیمیت کے اس اندھیرے میں انسانیت کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی بھی کہیں نظر آجاتی تھی:

پڑی تھی کٹی گھاس پر ایک عورت
قریب اس کے بیٹھی تھی اک نیک عورت
لیے اپنی آغوش میں ایک بچّہ!
پلاتی تھی بیٹھی ہوئی دودھ اپنا

. . . . . !

یہ ایک سکھ عورت تھی جس نے اپنی ایک مسلمان سہیلی کے اس بچّے کو سینے سے لگا رکھا تھا اور اب مسافر کے حوالے کر دیا۔

مسافر نے شقاوت کی تاریکی میں محبت کا یہ نور دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا:

تب آہستہ بچے کو اس نے اٹھایا
کیا پیار سینے سے اس کو لگایا
کہا پھر پلٹ کر یہ با چشم پُرنم
"سلام اے محبت کی دیوی، چلے ہم!"

.....!

مسافر کے قدم آگے بڑھ رہے تھے ـــــ منزل کی طرف۔ وہ منزل جس تک پہنچنے کے لیے زخم، غم اور موت کی وادی سے گزرنا تھا۔ لیکن وہ پیر مرد دانا:

کچھ اپنے خیالوں میں غلطاں و پیچاں
لیے عزم کہسار و ذہن بہاراں
چلا جا رہا تھا وہ پیر جواں دل
نہ کچھ خوفِ طوفاں، نہ تشویشِ ساحل

وہ چلتا رہا۔ خطروں سے گزرتا رہا۔ دشمنوں سے کتراتا۔ چھپتا۔ جھکائی دیتا۔ نیزوں، سنگینوں اور گولیوں کی زد سے بچتا۔ ایک لاوارث کشتی پر دشمن کی نظر بچا کر بچے سمیت بیٹھا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی سر سے گزرتی رہیں۔ وہ سر جھکائے چپو چلاتا رہا، اور آخر کار:

لگی ہونے وہ آ کر کنارے
جنوں کی ہوئی فتح، طوفاں ہارے

بے شک جنوں جیت گیا۔ طوفانوں نے ہار مان لی۔ جسے دیس نکالا ملا تھا۔ وہ ایک نئے دیس ـــــ پاکستان ـــــ میں جان کی بازی لگا کر، سب کچھ کھو کر، لٹا کر، قربان کر کے پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا، اور یکایک اس کے گانوں میں ترانۂ غیب گونجنے لگا:

شہیدِ محبت کا حق سرفرازی
جو ہارا، وہ جیتا دل و جاں کی بازی

بھر رنگ فطرت پر کہتی ہے ہمت
کبھی دل نوازی، کبھی بے نیازی

یہ صرف ترانہ ہی نہیں تھا۔ اس میں حکمت و موعظت، اور پند و تذکیر کی روح بھی تھی:

نظر ہو خلیلی تو آتش گلستاں
کلیمی میں مضمر ہے خارا گدازی
بسائیں گے بستی نئی حق کے بندے
دلوں کے حجازی تھموں کے غازی
اخوت کے بانی، صداقت کے پیکر
تفکر کے رومی تجسس کے رازی
مبارک سفر تیرا حق کے مسافر
پرے چرخ سے ہے تری ترکتازی
"ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

مسافر کا سفر ختم ہو گیا۔
لیکن فکر شاعر کی بے قراریاں قائم ہیں۔ سول سروس اکیڈیمی کے نوجوان کو شاعر پیام دیتا ہے:

نگاہیں تاک میں ہیں دشمنوں کی غیروں کی
چھٹا ہے ہم سے جو سالار راہ داں اپنا

قائد اعظم کی جدائی ایک حادثہ اور سانحہ ضرور ہے لیکن کبھی کبھی کوئی حادثہ سمند عمل کے لیے

مہمیز کا کام بھی دیتا ہے:

جہاں کی تیرہ شبی کا علاج ہے مسلم

مہ و ستارہ ہم رکھتا ہے نشاں اپنا

.....!

اس کے بعد "پیارا پاکستان" اور "اے مردِ وطن" کے عنوان سے دو نظمیں ملتی ہیں۔ ان کی روانی، سلاست، شگفتگی اور جاذبیت اس کی مقتضی تھی کہ انھی میں سے چند اشعار چھانٹ کر "ترانۂ پاکستان" بنا لیے جاتے۔

آخری نظم ہے "کراچی"۔

کراچی ـــــ قائداعظم کا وطن اور مدفن۔

اس شہر میں پہنچ کر شاعر کے واردات نغمۂ سرمدی بن جاتے ہیں۔ آپ بھی سن لیجیے۔ "کچھ کہیں سے کچھ کہیں سے"۔

شاعر کے لب ہلتے ہیں:

اس کو نسبت اس سے ہے جس سے محبت ہے ہمیں
آج بھی جس کی ہدایت کی ضرورت ہے ہمیں!
اس زمیں سے جھک کے ملتی گنبدِ افلاک ہے
دفن اس میں قائداعظم کی خاکِ پاک ہے

اور اس کے بعد شاعر کی چشمِ تصور قائداعظم کا نظارہ کرتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے:

قائداعظم تجھے ہم یاد کرتے ہیں بہت
مشکلیں جب آپڑیں، فریاد کرتے ہیں بہت
جن سے امیدیں تھیں اک دن توڑ دیں گے زعم دیر
اب مناتے پھرتے ہیں ہم ان کے ایمانوں کی خیر

عہد قبل از انقلاب کی قیادت کی یہ کتنی کامیاب صورت گری ہے۔

لیکن ابھی یہ سلسلہ جاری ہے:

وادیٔ کشمیر کے چشمے تڑپتے رہ گئے
دوستوں کی دوست داری ہم پرکھتے رہ گئے
کچھ بھا جو آج تک بھی خانماں بردوش ہیں
لیڈروں کے نعرے سنتے ہیں مگر خاموش ہیں
تارکانِ ملک اپنی جائدادیں دے گئے
اور اپنے ساتھ ایمانِ مسلماں لے گئے
دن بدن بڑھتا گیا سرمایۂ سرمایہ دار
چشمِ ناداری ہے تصویر مزارِ انتظار
تنگ نظری، تنگ ظرفی، بے اصولی عام ہیں
بے حسی ہے، یاس ہے اور کچھ غم بے نام ہیں
باغبانوں نے کیا تاراج خود اپنا چمن
ہوگئے ہم "ننگ انساں، ننگ دیں، ننگ وطن"
ناتواں ہیں، بے اثر ہیں صاحب جوہر نہیں!
اب کہاں جائیں کہ تیرا ہاتھ بھی سر پر نہیں

ان اشعار میں سوز و گداز کی جو کیفیت ہے۔ زبان و بیان کا جو لطف ہے۔ "غم بے نام" جیسی جدید ترکیبوں کی جو لذت ایجاد ہے، اس سے قطع نظر کیا صرف یہ ایک شعر ایک پوری داستانِ درد اور قائد سے فرطِ عقیدت کی انتہا نہیں؟

ناتواں ہیں، بے اثر ہیں، صاحب جوہر نہیں
اب کہاں جائیں کہ تیرا ہاتھ بھی سر پر نہیں!

یہ کتاب مرکزی مجلس ترقی اردو لاہور نے "عروس جمیل در لباس حریر" کی صورت میں شائع کی ہے۔ نظر فروز ٹائپ، کاغذ سفید اور دبیز، طباعت عمدہ، ٹائیٹل پیج خوش نما

اور دیدہ زیب۔ جلد مضبوط اور خوب صورت۔ البتہ یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ اتنی عمدہ کتاب میں بھی کمپوزنگ کی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔

یہ کتاب ہر گھر، ہر درس گاہ اور ہر لائبریری میں ہونی چاہیے۔

بہزاد پاکستان عبدالرحمٰن چغتائی کی متعدد تصویریں بھی جو اشعار کی ترجمانی کرتی ہیں شامل کر دی گئی ہیں۔ پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں چغتائی صاحب کے آرٹ سے محبت اور عقیدت رکھنے والے حدِ شمار سے خارج ہیں۔ ایسے حضرات کے لیے یہ تصویریں بجائے خود ایک گراں بہا تحفہ ہیں۔ اور کوئی شبہ نہیں ان سے کتاب کی "رونق" میں اضافہ ہو گیا ہے۔

نقد و تبصرہ

رئیس احمد جعفری

صدرالدین عارف

یہ کتاب جناب نور احمد خاں فریدی نے مرتب کی ہے۔ ملتان اولیاء و اصفیا کی سرزمین ہے اس خاک پاک سے بڑے بڑے اللہ والے بزرگ گزرے ہیں جن کی نگاہِ کیمیا تاثیر نے دلوں کی دنیا بدل دی۔ بلکہ دل سے زنگِ کفر دور کر دیا، اور نور اسلام سے منور کر دیا۔ اسی گروہ کے ایک فردِ فرید، حضرت صدرالدین عارف تھے۔ یہ کتاب انھی کے احوال و سوانح پر مشتمل ہے اور اس درجہ جامع اور مکمل ہے کہ جیسا کہ حضرت اسد ملتانی مرحوم نے اپنی تقریظ میں لکھا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم نے "تقریب" کے عنوان سے اپنے تاثرات کا ذکر دل نشین انداز میں فرمایا ہے۔ اور کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے کتاب کی تعریف میں مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے صرف بیانِ حقیقت پر اکتفا کیا ہے۔

کتاب بہترین ٹائپ میں، بہترین کاغذ پر چھپی ہے۔ ضخامت تقریباً چار سو صفحے قیمت دس روپے۔ ملنے کا پتہ "قصر الادب" جگو والہ، براہ لودھراں، ضلع ملتان۔

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا اس سے زیادہ اہم مباحث پر مشتمل ہوگا۔ اور یقیناً اپنی افادیت میں بھی "نقشِ ثانی" ثابت ہوگا۔ فریدی صاحب کا انداز بیان دل نشین اور شگفتہ ہے۔ پوری کتاب پڑھ جایئے کہیں بھی طبیعت اکتاتی نہیں۔ اور بلاشبہ یہ مصنف کی سحر بیانی کی دلیل ہے۔